بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اسلام ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر پوری طرح محیط ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارے میں انسانیت کو اس سے مکمل ہدایت اور رہنمائی نہ حاصل ہوتی ہو۔ اسلام کے اگر اس امتیازی وصف کو سامنے رکھ کر اس کے مزاج کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اپنے اندر کسی ایسی معمولی آمیزش کو بھی گوارا نہیں کرتا جو اس کے مزاج سے تھوڑی سی مغایرت بھی رکھتی ہو۔ اس کی یہ "غیر مصالحانہ فطرت" اس کی ہمہ گیری کا بالکل فطری نتیجہ ہے۔ دنیا کا کوئی نظام اپنی تعلیمات کے اعتبار سے جتنا ہمہ گیر ہوگا اتنا ہی وہ وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس کے معاملے میں غیر معمولی حد تک حساس ہوگا، اور اپنے اندر اُن عناصر کو کبھی برداشت نہ کریگا جو اس کے مزاج سے بنیادی طور پر مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

جب تک امتِ مسلمہ کو اسلام کے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے پر یقین رہا اس وقت تک اُس نے اس کے اندر کسی دوسرے مذہب یا نظام کے اجزا کو شامل کرنا گوارا نہ کیا، بلکہ اِس امر کی پوری کوشش کی کہ اس میں باطل کے جو اجزا کسی طرح خلط ملط ہو گئے ہیں انہیں پوری محنت اور دیدہ وری سے چُن چُن کر الگ کر دیا جائے تاکہ خالص اسلام ہر شعبۂ حیات میں انسانیت کو صحیح صحیح رہنمائی دے سکے۔

مگر اب جبکہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد کو اسلام کی ہمہ گیری پر یقین کامل نہیں رہا ہے

اور امت کے مغرب زدہ طبقے مغربی افکار و نظریات اور مغربی تہذیب و تمدن سے نہ صرف مرعوب بلکہ پوری طرح مغلوب ہو چکے ہیں تو اس وقت مسلم قوم کے بعض اطبا اسلامی اور غیر اسلامی اجزاء کو ملا کر ایسے مرکب تیار کر رہے ہیں جو ملت کو صحت مند بنانے کے بجائے اسے جلد ہی مفلوج کر کے رکھ دیں گے۔ اسی قسم کے بیشمار مرکبات میں ایک مشہور مرکب "اسلامی سوشلزم" ہے۔

اس مرکب کے متضاد عناصر کا تجزیہ کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب سے پہلے اُن مصالح کا جائزہ لیں جن کی وجہ سے اس مرکب کے تیار کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔

غیب کا علم تو خدا کو ہے لیکن ہمارے اس ملک کا برسر اقتدار طبقہ اسلام کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ اگر اس کے انفرادی تقاضوں سے نہیں تو کم از کم اس کے اجتماعی تقاضوں سے ضرور گلو خلاصی حاصل کرنے کا آرزومند ہے۔ وہ اس مقصد کو ڈنکے کی چوٹ حاصل کرتا لیکن چونکہ قوم ابھی اس بات پر آمادہ نظر نہیں آتی، اور اس بنا پر اس کے اندر قیادت اور سیادت قائم کرنے کے لیے اسلام کی محبت کا دم بھرنا ناگزیر ہے، اس لیے محتاط راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ کافرانہ افکار و نظریات اور ملحدانہ تصورات کے ساتھ اسلام کو چپکائے رکھا جائے۔ اسلامی سوشلزم کوئی متعین اسلوبِ حیات نہیں بلکہ اسلام سے فرار اور سوشلزم سے نئی وابستگی کی واضح دلیل ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اسلام کے کئی گوشے تشنۂ تکمیل ہیں جن کی تکمیل کے لیے سوشلزم کو اپنانا ضروری ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حقیقت میں اتباع اور پیروی تو سوشلزم کی ہے، اور یہی مقصدِ حیات ہے، لیکن اس میں خاص طور پر وہ پہلو اپنانے کے قابل ہیں جن کی کسی طرح اسلام میں گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔

آپ جب کسی مکمل اور اکمل چیز کے ساتھ کسی دوسری شئے کا پیوند لگاتے ہیں تو اس کی وجہ

بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کے نزدیک ناقص ہے اس وجہ سے باہر سے مانگ تانگ کر اُسے مکمل کرنے کی فکر دامنگیر ہے۔

یہ وجہ اگرچہ بڑی اہم ہے اور ذہنی مرعوبیت اسی قسم کا غلامانہ طرزِ فکر پیدا کرتی ہے لیکن ہمارے نزدیک اس مرکب کے تیار کرنے کی بڑی وجہ دَورِ جدید میں سوشلزم کی انقلاب آفرینی ہے۔ مغرب کا نظریہ "انفرادیت پسندی" (INDIVIDUALISM) جو آج سے دو سو سال پیشتر بڑا انقلاب انگیز تھا، اور جس کے نتیجے میں جمہوریت اور سرمایہ داری پروان چڑھیں، اب اپنی قوت و طاقت قریب قریب کھو بیٹھا ہے اور اس بنا پر اس میں وہ قوت و طاقت باقی نہیں رہی جو کسی قوم کے اندر حرکت اور حرارت پیدا کر سکے۔ اس نظریہ نے بلا شبہ اپنے عہدِ آغاز میں اسلامی نظامِ حیات کے ساتھ شدید تصادم پیدا کیا، اور امتِ مسلمہ کو کافی نقصان پہنچایا، لیکن اب جبکہ یہ خود راکھ بن چکا ہے، اسلامی اقدار کے لیے خوفناک حد تک مہلک نہیں بن سکتا۔

اشتراکیت اور اشتمالیت کا معاملہ اس سے بہرحال مختلف ہے۔ یہ نظام "انفرادیت" کو پوری طرح شکست دے کر پوری قوت اور توانائی کے ساتھ دنیا میں اُبھرا ہے۔ اس کی رگوں میں تازہ خون جاری ہے، یہ تسخیر کے بڑے اونچے عزائم رکھتا ہے۔ یہ تمام مخالف نظامہائے حیات کو مٹا کر پوری دنیا پر اپنا تسلط اور برتری قائم کرنے کا عزم بالجزم رکھتا ہے۔ فی الحال اس کے مزاج میں بلا کی طوفان خیزی ہے۔ اور یہ "ہر نقشِ کہن" کو باطل سمجھ کر دنیا سے نیست و نابود کرنا اپنا اوّلین اور بنیادی فرض سمجھتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے اس نظام نے جس معاشرے میں بھی اپنے قدم جمائے، اُس معاشرے کے سارے افکار و نظریات تہ و بالا ہو کر رہ گئے۔ وہ اقدارِ حیات جو کبھی اُسے جان سے زیادہ عزیز تھیں، اور جن کی وجہ سے اُسے دنیا میں سربلندی حاصل ہوئی تھی، سب حرفِ غلط کی طرح مٹا دی گئیں۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے فکر و نظر کے زاویے بدلے، خوب و ناخوب کے

پیمانے بدلے، عزت و آبرو کے معیار بدلے، غرض پوری زندگی اپنے سارے مقتضیات کے ساتھ سرتا پا تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اشتراکیت کا یہ انقلاب انگیز مزاج ہر نئے نظام کے مزاج کا خاصہ ہے۔ فلسفۂ تاریخ کے ایک بہت بڑے مفکر نے نظامہائے حیات کے تغیر و تبدل پر بحث کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے کہ جس طرح ایک خندق کو عبور کرتے ہوئے ایک کنارے اور اس کے دوسرے کنارے کے مابین پاؤں جمانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور انسان ایک ہی جست میں یہ سارا فاصلہ طے کرنے پر مجبور ہوتا ہے، بالکل اسی طرح دنیا کا ہر نظام جو اپنی فرمانروائی قائم کرنے کا عزم لے کر اٹھا ہو وہ اس وقت تک چین نہیں لیتا جب تک ہر مخالف نظام کو مٹا کر اپنا تسلط پوری طرح قائم نہ کر دے۔ کسی نظامِ حیات میں دوسرے نظاموں کے جو مختلف پیوند لگنے شروع ہوتے ہیں تو یہ مراحل اس وقت آتے ہیں جب اس کے قیام کے بعد اس کے علمبرداروں کی غفلت اور بے پروائی سے اس کی انقلابی روح مردہ پڑ جاتی ہے۔

اشتراکیت اس وقت ایک انقلاب انگیز قوت ہے۔ یہ ایک ایسا ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کو ایک خاص نہج پر مرتب کرنے کا داعیہ رکھتا ہے۔ مذہب، اخلاق، معیشت، معاشرت، تہذیب، تمدن، ادب، قانون غرضیکہ زندگی کے سارے گوشوں میں یہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس مقصد کی کامیابی کا سارا دارومدار اس بات پر موقوف ہے کہ سب سے پہلے ہر مروجہ قدر کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے تاکہ اس کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ اور پھر صاف اور ہموار زمین پر اشتراکیت کا رفیع الشان قصر اس کے اپنے دلپسند نقشے کے مطابق تعمیر کیا جائے۔ اگر آپ اشتراکیت کی "کامرانیوں" کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے جس غیر معمولی جبر و تشدد اور جس سرعت کے ساتھ ماضی کے ہر نقش کو مٹایا ہے وہ تاریخ

کی نہ صرف ایک نہایت ہی دلفگار بلکہ عبرتناک داستان ہے۔

آج اشتراکیت کو اپنانے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ ہم صرف وسائلِ رزق کو قومی تحویل میں دینا چاہتے ہیں، تاکہ کمزور اور بے بس طبقے ظالم سرمایہ داروں کے چنگل سے آزاد ہو جائیں، بلکہ اسے اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی متاعِ حیات کو ایک بے رحم طوفان کی نذر کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مغرب کے وہ دانشور جو امتِ مسلمہ سے اُس کی سب سے قیمتی متاع، یعنی متاعِ ایمان چھین کر اُس کی جگہ الحاد جیسی جنس کا سد تھما دینے کا ناپاک عزم رکھتے ہیں، برسوں کے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اشتراکیت خواہ مغربی ممالک میں کتنا ہی عظیم خطرہ کیوں نہ ہو، مگر مشرقی ممالک کو مغربی تہذیب و تمدن کا پرستار بنانے کے لیے ایک نہایت مفید، موثر اور کارآمد ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس کی مدد سے مذہب اور دین کی ساری اقدار کو بآسانی مٹایا جا سکتا ہے۔ ان دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے جن نقوش کو مغربی جمہوریت اور سرمایہ داری برسوں کی محنت اور مال و متاع کے غیر معمولی زیاں کے باوجود مٹانے میں ناکام رہی ہیں انہیں اشتراکیت کا تند و تیز ریلا بڑی آسانی کے ساتھ اپنے ساتھ بہا لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

پھر بعض مسلم ممالک میں اسلامی سوشلزم کا مرکب خاص طور پر اس لیے تیار کیا گیا ہے کہ یہ نسخہ وہاں کے برسرِ اقتدار طبقوں کی من مانی کارروائیوں کے لیے خاص طور پر مفید اور کارآمد ہے۔ اشتراکیت کا کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ فائدہ تو بہر حال لازمی ہے کہ اس سے ملک کے سارے وسائل برسرِ اقتدار طبقے کے ہاتھ میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اس بنا پر اُسے غیر معمولی قوت و طاقت حاصل ہوتی ہے اور وہ بلا شرکتِ غیرے ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بن جاتا ہے۔

مسلم ممالک میں اسلامی سوشلزم کا جو نعرہ بڑے زور سے بلند کیا جا رہا ہے اور اسی کو ان بدنصیب ممالک کے تمام دکھوں کا مداوا بیان کیا جا رہا ہے تو اس کی وجہ بجز اس کے کوئی نہیں کہ ان تمام ممالک میں اقتدار کے تخت پر جو حضرات قابض ہیں، چونکہ وہ رائے عامہ کی تائید سے اقتدار

پر مسلط نہیں ہوئے بلکہ مختلف قسم کی سازشوں سے انہوں نے یہ بلند مقام حاصل کیا ہے۔ اس لیے وہ ایسے سیاسی فلسفوں کے پرچار پر مجبور رہیں جن سے اُن کے فسطائی طرزِ عمل کی تائید ہوتی ہو۔ ان حضرات کی اس وقت بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ کسی ایسے نظریۂ حیات کو مقبول بنائیں جو اُن کے بالجبر حاصل کیے ہوئے اقتدار کے لیے جواز ثابت ہو سکتا ہو، اور پھر ان کے اس اقتدار کی مدت کو زیادہ سے زیادہ لمبا کرنے کے لیے انہیں تمام وسائل پر قبضہ کر لینے میں مدد دے۔

اس مقصد کے لیے سوشلزم سے زیادہ کونسا فلسفہ مفید اور کارآمد ہو سکتا تھا۔ اس سے سب سے پہلے اس امر کا جواز مل جاتا ہے کہ اگر آپ کے پاس قوت و طاقت ہے، تو آپ اجتماعی مفاد کو آڑ بنا کر کسی معاشرے کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام کو جس طرح چاہیں درہم برہم کر کے رکھ دیں۔ پھر یہ اجتماعی مفاد بھی کوئی ایسا نصب العین نہیں جو پورے معاشرے کے دل کی آواز ہو، بلکہ اجتماعی مفاد کا تعین کرنا برسرِ اقتدار طبقے کا اپنا ہی کام ہے۔ وہ جس مفاد کو اجتماعی مفاد کہہ دے وہی اُس پورے معاشرے کا مفاد کہلانے کا مستحق ہے، اور اسی مقصد کے لیے ہر فرد کو بلا سوچے سمجھے تن من دھن قربان کر دینا چاہیے۔ حکمران طبقہ کے مشخص کردہ اجتماعی مفاد کے سوا اور کوئی مفاد اجتماعی نہیں ہو سکتا اور جو شخص بھی اس سے سرِ مُو انحراف کرے یا اس سے معمولی اختلاف کرے وہ ملک و ملت کا انتہائی بدخواہ اور دشمن ہے، اور جو چیز بھی اس کے حصول کی راہ میں حائل ہو اُسے برباد کرنا قوم کا اہم فریضہ ہے۔ چنانچہ اسی اجتماعی مفاد کے حضور میں مسلمان قوم کو اپنی مقدس روایات تک کے نذرانے پیش کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور اُس سے اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی ہر قیمتی سے قیمتی چیز کو اس اجتماعی مفاد کی بھینٹ چڑھا دے۔ اس قسم کا آمرانہ طرزِ فکر اور جابرانہ طرزِ عمل کسی ایسے معاشرے میں کس طرح پنپ سکتا ہے جس میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے رائے عامہ کی تائید ضروری ہو اور جس میں قوم کی فلاح و بہبود کا فیصلہ صرف برسرِ اقتدار طبقے کا پیدائشی حق نہ سمجھا جاتا ہو بلکہ اس کے تعین میں عوام کی رائے کو بھی کافی عمل دخل حاصل ہو۔ جس معاشرے میں اقتدار جبر کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہو اور جس میں حکمران طبقہ اپنی

کبریائی کے مدت دراز تک ٹھاٹھ جمانے کے ارمان رکھتا ہو اس کے لیے کارگر نسخہ صرف اشتراکیت ہے۔

ان گزارشات کے بعد، جن میں ہم نے اُن محرکات کی نشاندہی کی ہے جن کے تحت مسلم ممالک میں "اسلامی سوشلزم" پر خاص طور پر زور دیا جا رہا ہے، اب آپ یہ دیکھیں کہ یہ مرکب اپنے اجزا کی نوعیت کے اعتبار سے کتنا ناقص بلکہ نقصان دہ ہے۔ لیکن اس موضوع پر اظہارِ خیال سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک نگاہ اس پس منظر پر بھی ڈال لی جائے جس میں سوشلزم نے جنم لیا ہے تاکہ اس کے عناصرِ ترکیبی کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اشتراکیت درحقیقت کوئی ایسا نظامِ حیات نہیں جو مثبت اقدار پر مبنی ہو۔ یہ سراسر منفی تحریک ہے جو مغرب میں انفرادیت پسندی (INDIVIDUALISM) کے غیر متوازن اور حد سے بڑھے ہوئے رجحان کے ردِ عمل میں پیدا ہوئی۔

دنیا کی ہر انسانی تحریک کی طرح انفرادیت پسندی اور اشتراکیت دونوں تحریکیں سراسر باطل نہ تھیں۔ ان میں بہت سے پہلو حق و صداقت کے بھی تھے۔ لیکن ان دونوں کی انتہا پسندی نے انہیں انسانیت کے لیے مفید بنانے کی بجائے نقصان دہ بنا کر رکھ دیا۔

انفرادیت پسندی کا یہ پہلو بہر حال صحیح ہے کہ کسی معاشرے میں مرکزی مقام فرد ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ فرد وہ بنیادی اکائی ہے جس پر معاشرے کی سر بفلک عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ ہدایت و رہنمائی کے مقدس کام کا آغاز بھی فرد ہی سے ہوتا ہے اور اجتماعی بگاڑ کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے۔ اس بنا پر تعمیر و ترقی کا کوئی کام فرد کو بحیثیتِ فرد نظر انداز کر کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا، اور معاشرتی بگاڑ اور اس کے تباہ کن اثرات کا اندازہ افراد ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ پھر اگر اس معاملے کو مذہبی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب نے بھی فرد ہی کو بنیادی اکائی تصور کر کے اس کی اصلاح کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق دیا ہے

اور اسے بحیثیتِ فرد ہی اپنے ہر قول اور فعل کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ جب فرد کو اس دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے تو لامحالہ اجتماعی تگ و دو کا منتہائے مقصود فرد کی بھلائی ہی ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہے اور اس بنا پر ہر فرد اپنا یہ جائز حق رکھتا ہے کہ وہ معاشرے سے اپنی آزادی، خودمختاری اور اپنے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کا تقاضا کرے۔ مگر دیکھیے کہ فرد کا جو حق اپنے فطری حدود کے اندر رہتے ہوتے بالکل صحیح اور مبنی بر انصاف ہے، وہی جب جائز حدود سے تجاوز کرتا ہے تو معاشرے کے لیے کتنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ کسی فرد کا حق اسی صورت میں قابلِ احترام ہے جب اس سے دوسروں کے حقوق پامال نہ ہوتے ہوں لیکن جب ایک فرد یا چند افراد چالاکی اور عیاری سے، یا اپنی قوت و طاقت سے اپنے حقوق کے دائرے کو اتنا وسیع کر دیں کہ اُن سے دوسروں کے حقوق پر دست درازی ہوتی ہو، اور معاشرہ بحیثیتِ مجموعی نقصان اٹھاتا ہو، تو معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام اور حفظ و بقا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔

فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کا مسئلہ صنعتی انقلاب سے پہلے کچھ بہت زیادہ پیچیدہ نہ تھا۔ لیکن اس ہمہ گیر انقلاب کے بعد جب وسائلِ رزق پر ایک مختصر سے طبقے کا قبضہ ہونے لگا، اور اس قبضے کی وجہ سے قوت و اقتدار کی باگیں بھی خود بخود اسی کے ہاتھ میں آگئیں، تو اس وقت اس سوال نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی۔

انفرادیت پسندی کے علمبرداروں نے بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ وہ اپنے ہر انفرادی اور اجتماعی فعل میں آزاد اور خودمختار ہیں، اور معاشرے سے جس طرح فائدہ اٹھانا چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ ریاست یا معاشرے کو اس بات کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اُن کے معاملات میں دخیل ہو۔ معاشرہ اور ریاست افراد کی خداداد صلاحیتوں کو کام کا موقع دینے کے لیے ہیں۔ اُن کا کام افراد کی سرگرمیوں پر پابندی لگانا نہیں بلکہ اس امر کا التزام کرنا ہے کہ کوئی

دوسرا اُن کی سرگرمیوں میں دخیل نہ ہونے پائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی تگ و دو کو ایک خاموش تماشائی بن کر دیکھتی رہے۔ البتہ جب کوئی اس میں مداخلت کرے تو اُسے پوری قوت سے دبا دے۔ چنانچہ اس انفرادیت پسندی کے نظام میں ریاست کے فرائض صرف دو کاموں پر مشتمل تھے۔ بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ اور داخلی انتشار سے حفاظت۔ اس طرزِ فکر کے نتیجے میں جو نظامِ ریاست، جو نظامِ معیشت اور جو نظامِ معاشرت قائم ہوا وہ سراسر چند چالاک اور مالی اعتبار سے مضبوط افراد کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ افراد جس طرح چاہتے معاشرے کے کمزور اور بے بس لوگوں کو لوٹتے اور حکومت کی سنگینیں ان کی حفاظت کرتیں، عدالتیں ان کے مفادات کی پاسبان اور نگراں ہوتیں، ملکی قوانین ان کی ان ظالمانہ کاروائیوں کی تائید کرتے۔ اس طرح ان لوگوں نے نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر عوام میں جیسے چاہا دستِ ظلم دراز کیا اور اُن کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ ڈالا۔ اس ظلم و استبداد سے گھبرا کر اگر عوام میں کوئی تحریک پیدا ہوتی تو حکومت اُسے سختی سے دبا دیتی۔ اگر وہ بیچارے عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ جن ایوانوں کو وہ غریبوں اور بے کسوں کی آخری پناہ گاہ خیال کر رہے ہیں وہ صرف امراء کے حقوق کے محافظ ہیں۔ غرض زندگی ان کمزوروں کے لیے پوری طرح عذاب بن کر رہ گئی تھی۔

اسے محض انسانیت کی بدقسمتی سمجھیے کہ ان اندوہناک حالات میں جب غریبوں کے لیے جینا تک دشوار ہو چکا تھا، مذہب نے بھی کوئی دستگیری نہ کی۔ یہ معاشرہ جس مذہب سے آشنا تھا وہ پادریوں کا مذہب تھا جس میں انفرادی زندگی کی اصلاح کے لیے تو کچھ نہ کچھ تعلیمات موجود تھیں مگر اجتماعی معاملات میں انسان کے لیے کوئی واضح ہدایت اور کوئی جامع پروگرام نہ تھا۔ مذہب کی تاریخ اس حقیقت پر پوری طرح گواہ ہے کہ اس نے ہمیشہ کمزوروں اور بے بسوں کی پشت پناہی کی ہے اور اس کے اندر ستم رسیدہ مخلوق نے ہمیشہ پناہ لی ہے۔ اس بنا پر بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر یورپ میں مذہب اپنی صحیح اور اصلی شکل میں ہوتا تو وہ اوّل تو

حالات کو اس حد تک بگڑنے ہی نہ دیتا، اور اگر وہ بگڑ ہی جاتے تو اس آڑے وقت میں وہ غریبوں کی معاونت اور دستگیری کرتا، انہیں امراء کی ریشہ دوانیوں سے بچاتا اور بے کسوں کو اس بات پر آمادہ کرتا کہ وہ اپنے جائز حقوق کی حفاظت کے لیے ظلم کے خلاف صف آرا ہوں لیکن مذہب کی جو صورت مغرب میں اُس وقت موجود تھی وہ بڑی مسخ شدہ تھی۔ اُس کا دائرہ صرف انفرادی وعظ و نصیحت تک محدود تھا۔ اس میں اجتماعی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اس بنا پر مسیحیت بھی غریبوں اور ستم زدوں کی کوئی خبر گیری نہ کر سکی اور اس نے بڑی خاموشی کے ساتھ اُنہیں سرمایہ دار طبقوں کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھا۔

آغاز میں تو مسیحیت نے اس زبردست آزاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن جب اُس نے دیکھا کہ وہ اجتماعی زندگی میں عملاً کوئی رہنمائی نہیں دے سکتی تو پھر وہ پوری طرح اس میدان سے دستکش ہو گئی اور اُس نے زور داروں کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دی کہ وہ معاشرے کے کمزور طبقوں کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔ چنانچہ سرمایہ داروں نے دین و دنیا کی ثنویت کے نظریہ کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور خدا کے خوف، آخرت کی باز پرس، ضمیر کی خلش سے یکسر بے پروا ہو کر حرص کی آگ کو جس طرح چاہا ٹھنڈا کیا۔

اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں عدل و انصاف کا جنازہ نکل گیا۔ انسان اور انسان کے درمیان شرافت اور اخلاقی و ذہنی صلاحیتوں کے مطابق امتیاز قائم ہونے کے بجائے بے جان سکوں کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم پیدا ہو گئی۔ ایک طرف ایک ایسا مختصر سا طبقہ بڑی سُرعت کے ساتھ ابھرا جس کے پاس روپے کی ریل پیل تھی، جو وسائلِ رزق پر قابض ہونے کی وجہ سے عوام کے لیے "ان داتا" تھا جس کی خواہشات اور منشا کے مطابق ملکی قوانین وضع کیے جاتے تھے اور جس کے مفادات کے حصول کے لیے دوسرے ممالک سے تعلقات استوار ہوتے تھے۔ پھر یہ طبقہ دولت کی ہوس میں اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ اسے اجتماعی تقاضے بالکل نظر نہ آتے

تھے۔ ایسے بے مروت، بے ضمیر، بے حس اور تنگ نظر طبقے سے اس کے سوا کس چیز کی توقع کی جا سکتی تھی کہ اُس کا جہاں تک بس چلے معاشرے میں ناجائز انتفاع کرے۔ اس طبقے کی دراز دستیوں کی وجہ سے عوام روٹی کے ایک ایک لقمے کے لیے ترسنے لگے، اُن کے اخلاق بگڑے، اُن کے ضمیر مُردہ ہوتے، اُن کی خودداری مجروح ہوئی اور انہوں نے جسم اور روح کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی ہر چیز کو سرمایہ دار کے قدموں پر نثار کر ڈالا۔

امیر اور غریب کے درمیان دولت نے جو خلیج حائل کر رکھی تھی وہ مسلسل بڑھتی رہی حتیٰ کہ پوری سوسائٹی بھیڑ بکریوں کا ایک ایسا گلہ بن کر رہ گئی جسے سرمایہ کی لاٹھی جس طرف چاہتی بالکل میکانکی طور پر ہانک کرلے جاتی۔

ہر وہ عمل جو اپنے فطری حدود سے متجاوز ہو، جس میں اعتدال قائم نہ رکھا گیا ہو، اور جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو، خود اپنا ایک ردِعمل پیدا کرتا ہے۔ اس ردِعمل میں توازن نہیں ہوتا۔ غیر متوازن طرزِ عمل غیر متوازن ردِعمل پر ہی منتج ہوتا ہے۔ یہی معاملہ انفرادیت پسندی کی غیر متوازن تحریک کے ساتھ بھی پیش آیا۔ پسے ہوئے عوام کے اندر خفتہ روح بیدار ہوئی اور انہوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے دولت وہ کماتے ہیں اور ایک مختصر سا عیار طبقہ محض وسائلِ رزق پر قابض ہونے کی وجہ سے اُن کی کمائی کا بیشتر حصہ ہتھیا لیتا ہے۔ اس احساس نے جو بالکل حقیقت پر مبنی تھا، آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کی اور سوچنے سمجھنے والے دماغ اس نتیجہ پر پہنچے کہ معاشرے میں جبر و استبداد کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ ذرائع پیداوار پر افراد قابض ہیں۔ اگر ان ذرائع کو معاشرے کی تحویل میں دے دیا جاتے تو پھر افراد غریبوں اور بے کسوں پر دستِ ظلم دراز نہ کر سکیں گے۔ اس نظریہ کو صحیح اور برحق ثابت کرنا اور اسے عملی جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے ایک فکری انقلاب کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ فکر و نظر کے اس عظیم تغیر کے لیے باقاعدہ ایک نیا فلسفہ گھڑا گیا۔

اس فلسفہ کی ابتدا بھی انسانی فطرت سے ہوئی۔ انسان کو قابلِ اعتماد اور اجتماعی ذمہ داریوں کا امین سمجھنے کے بجائے اُس کے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی کہ وہ فطری طور پر ناقابلِ اعتماد ہے وہ حرص و آز کا بندہ ہے، اُسے جب کوئی آزادی دی جائے گی تو لازمی طور پر وہ اُس سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا، اُسے جب بھی قوت حاصل ہوگی وہ اسے ابنائے جنس کی بربادی کے لیے استعمال کرے گا۔ اسے اپنے معاملات کا خود مختار بنا کر اُس سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع رکھنا محض خام خیالی ہے۔ طمع، حرص، بُرائی، سفاکی اور زبردست آزاری اُس کی فطرت میں داخل ہیں۔ انسانی فطرت کے بارے میں پیدائشی گناہ گار ہونے کا تصور مغربی ذہنوں میں ان کے مذہبی معتقدات کی بنا پر چونکہ پہلے ہی سے رچا بسا تھا۔ اس لیے انہوں نے اس تازہ تصورِ انسان کو سراسر حق سمجھ کر بڑے والہانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے انسانی فطرت کے بارے میں اس نظریہ کو کائنات کی سب سے بڑی سچائی سمجھ کر فوراً قبول کر لیا اور یہ سمجھنے لگے کہ اسے پا لینے کے بعد اب کائنات کی ساری گتھیاں خود بخود سلجھ جائیں گی۔

جب انسان فطری طور پر ظالم، سفاک، حرص کا غلام اور ناقابلِ اعتماد ٹھہرا تو اس کے شر سے محفوظ رہنے کی یہی صورت ممکن تھی کہ اُسے اجتماعی جکڑبندیوں میں پوری طرح جکڑ کر رکھ دیا جائے تاکہ اُس کی بدفطرت من مانی کارروائیاں کرنے سے باز رہے۔ اس کے جواز کے لیے بھی فرد اور معاشرے کے باہمی تعلقات کا پھر سے جائزہ لیا گیا اور یہ طے پایا کہ معاشرے میں جو ایک فرد کو بنیادی اکائی تصور کیا گیا ہے یہی درحقیقت فساد کا منبع ہے جس سے شر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ فرد اور معاشرے میں مرکزی اہمیت معاشرے کو حاصل ہے اور فرد اس کی خدمت اور چاکری کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ معاشرہ جس چیز کو فلاح کہہ دے وہی درحقیقت بھلائی ہے اور جسے وہ برائی قرار دے وہی فی الحقیقت برائی ہے۔ اس نئے نظریہ کے مطابق معیارِ حق و باطل افراد کی بہبود نہیں بلکہ معاشرے کی فلاح ہے۔

پروفیسر ٹائن بی نے فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کے بارے میں اشتراکی نقطۂ نظر پر جو بحث کی ہے وہ بڑی فکر انگیز ہے۔ معاشرے کا جمہوری تصور یہ ہے کہ معاشرہ افراد سے تعمیر ہوتا ہے۔ افراد کی بھلائی بالآخر معاشرے کی بھلائی پر منتج ہوتی ہے لیکن اشتراکی نظریہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں معاشرہ خود ایک قائم بالذات حقیقت ہے اور افراد محض اُس کے کل پُرزے ہیں۔ ان دونوں نظریات کے درمیان جو ایک لطیف سا فرق ہے اُسے فاضل مؤرخ نے ایک مثال سے واضح کیا ہے۔ جمہوری نظریہ کے مطابق معاشرہ ایک گلدستہ ہے جو مختلف پھول چن کر ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس میں بنیادی اہمیت پھولوں کو حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس اشتراکی نظریہ کی رُو سے معاشرہ ایک جاندار درخت کی حیثیت رکھتا ہے اور افراد محض اس کے پتّے ہیں۔ پہلے نظریہ کے مطابق جس طرح گلدستہ اپنے حسنِ ترتیب کے لیے رنگا رنگ پھولوں کا محتاج ہے بالکل اسی طرح معاشرہ بھی اجتماعی فوز و فلاح کے لیے افراد کا دستِ نگر ہے۔ افراد وہ بنیادی اکائیاں ہیں جن سے معاشرہ ترتیب پاتا ہے۔ مگر اشتراکی نظریہ کے مطابق افراد کی اپنی کوئی الگ اور مستقل حیثیت نہیں۔ وہ اپنی بقا اور فلاح کے لیے سراسر معاشرے کے محتاج ہیں۔ اگر وہ پتّوں کی طرح شجر سے وابستہ رہیں، اور معاشرہ جس قسم کی غذا انہیں فراہم کرے اسے بلاچون وچرا ہضم کرتے رہیں تو انہیں بہار کی کوئی امید ہو سکتی ہے ورنہ اُن کے لیے خزاں ہی خزاں ہے۔

طرزِ فکر کا یہ اختلاف کوئی معمولی نہیں بلکہ ایسے بنیادی تصورات کا اختلاف ہے جس نے دو مختلف نظامہائے حیات کو جنم دیا ہے۔ جس معاشرے میں فرد کو بنیادی اہمیت حاصل ہو وہاں جمہوری روایات پرورش پاتی ہیں، اور اس کے مقابلے میں جہاں معاشرے کو بنیاد قرار دے کر افراد کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں وہاں نہایت ظالمانہ قسم کی آمریت مسلّط ہوتی ہے۔ جب آپ یہ فرض کرلیں کہ موج کی جو کچھ افادیت ہے وہ صرف دریا میں شامل ہونے کی وجہ سے ہے اور بیرونِ دریا وہ قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتی تو موج کے لیے زندگی کا صرف ایک ہی راستہ ہے

کہ وہ اپنے آپ کو تند و تیز دھارے میں گم کر کے اپنے وجود کو یکسر فنا کر دے اور دھارا جس رُخ پر اُسے بہا کر لے جائے اُسی سمت بڑی خوش دلی کے ساتھ بہتی چلی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں معاشرے نے ایک سیلِ بے پناہ کی صورت میں انفرادیت کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

پھر اس معاملہ کا ایک اور قابلِ غور پہلو جس کی طرف پروفیسر ٹائن بی نے اشارہ کیا ہے وہ مذہبی عقائد اور نظامِ اخلاق ہے۔ جب فرد خود ایک حقیقت ہے اور معاشرہ اس کی فلاح و بہبود کے لیے معرضِ وجود میں آتا ہے تو وہ لازمی طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے نظامِ اخلاق کا پابند بنانے کی خواہش کرے گا جس میں مذہبی تقدیس ہو اور جو اُس کی مادی فلاح و بہبود کا ذریعہ بننے کے ساتھ ساتھ اُس کی روح کو بھی سکون مہیا کر سکے۔ اِس طرح وہ اپنا تعلقِ عبودیت اُس ذاتِ بے ہمتا سے جوڑے گا جسے وہ کائنات کی علّتِ اولیٰ سمجھتا ہے۔

خدا، مذہب اور روح کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ روح کا وجود اُسی صورت میں تسلیم کیا جا سکتا ہے جب فرد اپنی ایک الگ ذات رکھتا ہو، اور یہ ذات اپنے خالق و مالک سے اسی وقت رشتۂ عبودیت اُستوار کر سکتی ہے جب وہ ضرورت پیش آنے پر خدا کے سوا ساری کائنات سے بے نیاز ہو سکتی ہو۔ اگر یہ شخص غلطی سے فرض کرے کہ اُس کا وجود صرف معاشرے کا رہینِ منت ہے تو فطری طور پر معاشرے کو وہی ارفع و اعلیٰ مقام عطا کرے گا جو ایک خدا پرست خالقِ کائنات کو دیتا ہے۔ اس لیے وہ ہر اُس نظام سے بغاوت کرے گا جو معاشرے پر فوقیت رکھنے کا دعویدار ہو۔ اشتراکیت کے نزدیک معاشرے سے بڑا کوئی خدا نہیں اور اس کی بندگی سے بڑھ کر کوئی اور بندگی نہیں۔

اسلام حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت پسندی اور حد سے بڑھی ہوئی اجتماعیت کے مابین راہِ اعتدال ہے۔ یہ نہ تو فرد کو اتنی کھلی چھٹی دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اجتماعی مصالح کو اپنی حرص کی بھینٹ

چڑھاتا رہے، اور نہ معاشرے کو یہ حق دیتا ہے کہ افراد کو بے جان کل پرزے سمجھ کر جس طرح چاہے اُن سے کام لیتا رہے۔ اُن کا خدا بن کر اُن سے جس طرح چاہے خدمت اور چاکری کرتا رہے۔ خدا نے انسان کو بحیثیت فرد پیدا کیا ہے اس لیے اسلام اس کی انفرادیت کی پوری طرح حفاظت کرتا ہے لیکن چونکہ انسانیت کا صحیح نشوونما معاشرے کے ذریعہ ہی ممکن ہے اس لیے اسلام نے فرد اور معاشرے دونوں کے حقوق و فرائض کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا ہے تاکہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بنیں۔ معاشرے کا فرض یہ ہے کہ وہ فرد کی آزادی کا احترام کرے اور اُسے تمام وہ مواقع میسّر کرے جن کے ذریعہ اُس کی خداداد صلاحیتیں پوری طرح پروان چڑھیں اور پھر تعمیر اور ترقی کے اس راستہ پر صرف ہوں جو اللہ تعالیٰ نے متعین فرمایا ہے اور افراد کا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی فلاح میں مزاحم ہونے کے بجائے اس کے لیے معاون و مددگار ہوں۔ اِس طرح اسلام میں نہ تو فرد کو اجتماعی مفاد کے خلاف کام کرنے کی کھلی چھٹی دی جاتی ہے اور نہ معاشرہ افراد سے اپنی غیر مشروط اطاعت کا تقاضا کر کے انہیں اپنی بندگی میں گرفتار کرتا ہے اسلام نے فرد اور معاشرے دونوں کو اپنے احکام کا پابند بنایا ہے اور ان میں سے کسی کو بھی من مانی کارروائیاں کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑا۔

ہمارے اس ملک میں اسلامی سوشلزم کا جو غلغلہ بلند ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہاں اسلام کا احیاء مقصود ہے۔ بلکہ یہاں صرف یہ مقصد کام کر رہا ہے کہ اسلام نے فرد کو جو حقوق و مراعات دیتے ہیں انہیں سلب کر کے اور اُس نے اُس کی آزادی کا جس طرح احترام کیا ہے اُس کی یکسر نفی کر کے اشتراکیت کی اجتماعی جکڑبندیوں کے لیے زمین ہموار کی جاتے۔ اگرچہ اس وقت بڑے معصومانہ انداز میں کہا بھی جا رہا ہے کہ ہم وسائلِ رزق، اور اسی طرح اجتماعی زندگی کے بعض دوسرے شعبوں کو قومی تحویل میں لے کر اُس اجتماعی عدل کو قائم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کا منتہائے مقصود ہے۔ لیکن جو حضرات اتنے بلند بانگ دعوے کر رہے ہیں اُن کی بے بصیرتی اور اسلامی تعلیمات

(باقی صفحہ پر)

(بقیہ اشارات)

سے بے خبری کا یہ حال ہے کہ گزشتہ مہینے اسمبلی میں اس بات پر لے دے ہوتی رہی کہ کیا بنک اور انشورنس کو قومی تحویل میں دینا دینی نقطۂ نظر سے حلال ہے یا حرام۔ حالانکہ جس سُود پر یہ دونوں ادارے قائم ہیں وہ بجائے خود حرام ہے، اور اس کی موجودگی میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ان کو قومی ملکیت میں لینا حلال ہے یا حرام؟ کیا اسی طرح کل یہ بحث بھی اٹھائی جائے گی کہ قحبہ خانوں اور شراب خانوں کو قومی ملکیت میں لینا حلال ہے یا حرام؟

اس وقت ہمارے سامنے اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کیا اسلام میں کسی چیز کو قومی ملکیت میں لینے ——— (NATIONALZATION) کی سرے کوئی گنجائش ہے یا نہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا اسلام اس بات کو ایک نظریے اور اصول کے طور پر تسلیم کرتا ہے کہ وسائلِ پیداوار کو افراد کے قبضے میں نہ رہنا چاہیے اور لازماً ان کو قومی ملکیت ہی بنانا چاہیے؟ اس معاملہ میں کوئی شخص جو دینِ اسلام کو کچھ بھی جانتا ہے اور اشتراکی فلسفے سے نہیں بلکہ قرآن و سنّت سے رہنمائی حاصل کرتا ہے، یہ شبہ تک نہیں کرسکتا کہ اسلام میں اس نظریے اور اصول کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش ہے۔ البتہ اگر قومی ملکیت کو اصول اور نظریے کے طور پر نہ لیا جائے، اور کسی خاص صنعت، یا معاشی زندگی کے کسی مخصوص شعبے کے متعلق یہ ضرورت محسوس کی جائے کہ اسے ٹھیک چلانے کے لیے اس کو حکومت کے انتظام میں لینا ناگزیر ہے، تو اسلام اس میں مانع نہیں ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ معقول دلائل کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اندھا دھند نیشنلائزیشن، جس کے پیچھے محض اشتراکی نظریات سے مغلوبیت کام کر رہی ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے یکسر غلط ہے۔ اسلام آزادی کا محافظ اور پاسبان ہے اِس بنا پر وہ کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہتا جس سے لوگ اپنے ضمیر رہن رکھنے پر مجبور ہوں اور معاشرے کے تمام افراد حکومت کے ملازم بن کر زبان و ضمیر اور عمل کی آزادی سے محروم ہوجائیں۔ اشتراکیت کو اپنانے کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے تمام وسائلِ رزق پر حکومت کا

پورا قبضہ ہو اور وہ رازقِ مطلق بن کر جس کو جتنا چاہے اُس کی وفاداری کے مطابق دیتی رہے۔ جو شخص روٹی کے ایک ایک نوالے کے لیے دوسروں کا محتاج اور دست نگر ہو وہ آخر اپنے ضمیر اور ایمان کے مطابق کس طرح کوئی قدم اٹھا سکتا ہے۔ وہ لازمی طور پر اُسی راستے پر گامزن ہوگا جس پر اس کے "آقاے ولی نعمت" چلانا چاہتے ہیں۔

اشتراکیت خواہ کسی ملک میں جمہوریت کے راستے سے آئے یا تشدد کے ذریعے، لیکن عملاً صورت ایک ہی ہوگی کہ پوری قوم برسرِ اقتدار طبقہ کی نہایت ہی بے بس غلام بن کر رہ جائے گی۔ جمہوریت کے راستے سے آنے کے بعد جب پورے ملک کے وسائل پر ایک گروہ کا قبضہ ہو جائیگا تو پھر کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوگی بلکہ "جمہوری اشتراکیت" خود جمہوریت کے لیے موت کا پیغام ہوگی۔ اور اگر یہ تشدد کے ذریعے آئی تو ملک کا امن غارت ہوگا، انسانیت ترقی کرنے کے بجائے وحشت کا شکار ہوگی اور حالات مدتِ دراز تک بھی سنبھلنے نہ پائیں گے۔ اگر مسیحی ممالک میں جہاں مذہب کا کوئی جامع تصور نہیں اشتراکی انقلاب مال و جان کے غیر معمولی زیاں کے بعد آیا ہے تو اسلامی ممالک میں اس انقلاب کو برپا کرنے کے لیے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں جانیں تلف کرنی پڑیں گی۔ ممکن ہے چند لوگ اجتماعی انصاف کا خوش کُن نعرہ سُن کر آغاز میں دھوکہ کھا جائیں، لیکن جب اُن سے عملاً یہ تقاضا ہوگا کہ وہ خدا کی کبریائی کو چھوڑ کر برسرِ اقتدار طبقہ کی خدائی تسلیم کریں تو وہ اسے کسی صورت میں بھی پورا کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ پھر قوت و طاقت کے نشے میں بدمست اقتدار جب اُن سے اپنی خدائی بالجبر منوانے کے لیے آگے بڑھے گا تو اس وقت جتنا کشت و خون ہوگا اُس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ مسلم ملت کو یہ یوم بد نہ دکھائے اور مسلم ممالک کے سربراہوں کو اس قسم کے غلط اور خطرناک اقدام سے باز رکھے۔

ہم آخر میں ایک بات اس ملک کے تعلیم یافتہ اور باشعور طبقوں سے بھی کہنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہمارے ملک میں فکر و نظر کا جو انقلاب آرہا ہے اور اس کی تہ میں جو عوامل کار فرما ہیں اُن کا انہیں دقّتِ نظر سے جائزہ لینا چاہیے۔ آپ بے شک جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر سے اختلاف کریں لیکن خدارا اپنے ایمان، ضمیر، اپنی قوم اور اُس کے مستقبل کی تو فکر کیجیے۔ کیا آپ کو اس امر کا احساس نہیں کہ آج اسلامی سوشلزم کا نعرہ کن اغراض کے تحت لگایا جا رہا ہے۔ کیا آپ غفلت سے اس وقت بیدار ہونگے جب اسلام کے نام سے سوشلزم کا پورا تسلط ہو جائے گا اور حالات پر آپ کو کوئی اختیار باقی نہ رہے گا۔ اسلام کو کسی "ازم" کا لبادہ اوڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود ایک مکمل نظام ہے جس میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں پورے اعتدال کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں۔ یہ نظام خالقِ کائنات نے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے دیا ہے۔ آپ کسی نام نہاد اسلامی سوشلزم کو نہیں بلکہ پورے کے پورے اسلام کو اس ملک میں اور پھر پوری دنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ اُس شخص سے زیادہ بدنصیب کون ہو گا جس کے پاس ہر قسم کے پاک اور طیب کھانے موجود ہوں مگر وہ انہیں نظر انداز کر کے مختلف مقامات پر بکھری ہوئی غلاظتوں پر منہ مارنے کے لیے بیتاب ہو۔